میرا دوست ، میرا دشمن

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی ؛ جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہؤا کرتی تھی ۔ مجھے ایسے ہی نئے آدمیوں سے گھبراہٹ ہؤا کرتی تھی ، لیکن یہاں تو وہ نیا آدمی " منٹو " تھا جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی ۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی ۔ میں نے شاہد سے کہا : " چلو واپس چلیں ، شاید منٹو گھر پر نہ ہو ۔" مگر شاہد نے میری آمیدوں پر پانی پھیر دیا :

" وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے ، کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے ۔"

یہ لیجیے ، مرے پر سو درے ۔ ایک تو منٹو ، اور وہ بھی پیتا ہؤا منٹو ۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا ۔ ایسا بھی کیا ، مجھے کھا تو نہیں جائے گا ! ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے ۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی ۔ چرچراتی گرد آلو سیڑھیاں طے کرکے ہم دوسری منزل پر پہنچے ۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا ۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا ۔ دوسری طرف ایک بڑا سا

سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا ۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اکڑوں بیٹھا ہؤا تھا ۔

" آئیے آئیے ۔" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا ۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا ، لیکن جب کھڑا ہوتا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا ۔ اس کے جسم پر کھدر کا کرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی ۔

" ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی ، دبلی ، سوکھی ، مریل سی ہوں گی ۔" اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا ۔

" اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گلیہر ، چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے ۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک دم نہ ہاپٹے پر لے لے ۔

اور دوسرے لمحے ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصے ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اٹھایا ہو اور اسے پورا کرنا ہو ۔ دو تین بار بات الجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اٹھا رکھی ۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جملے کترتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے ، پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے — اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا ۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک

جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق ، جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا ۔

گھمسان کے بعد میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا : موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی ۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے — بہت قریب سے دیکھا ہے : قہقہہ لگاتے ، سنجیدگی سے مسکراتے ، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے ۔ وہی نازک نازک ہاتھ پیر ، سر پر ٹوکرا بھر بال ، ہکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت ۔ پیتے پیتے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا ۔ میرا ماتھا ٹھنکا ۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی ، اسے تو میں نے بچپن سے سنا تھا ۔ مجھے کوفت ہونے لگی ۔ نہ جانے کس بات پر میں نے کہا :

" یہ بالکل غلط ۔" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے ۔

" آپ کج بحثی کر رہی ہیں ۔"

" حماقت ہے یہ ۔"

" دھاندلی ہے عصمت بہن ۔"

" آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں ۔" میں نے چڑ کر کہا ۔

" بس یونہی ۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں ۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا ۔"

" تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں ۔"

" نہیں تو ۔ وہ کیسے جانا آپ نے ؟ "

" اس لیے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلاتے ، چڑاتے اور مارتے پیٹتے رہے یا پکڑ کر پٹواتے رہے ۔" منٹو زور سے ہنسا ۔

" تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا ۔"

" تو اتنا یاد رکھیے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں ۔ یہ آپ کو کھانسی ہے ، اس کا علاج کیوں نہیں کرتے ؟ "

" علاج ؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں ۔ تپن سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے ، تمہیں ٹی ۔ بی ہے ۔ ظاہر ہے کہ میں نے مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا ۔ اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں ، ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں ۔"

" یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے ۔"

" کون بزرگ ؟ "

" میرے بھائی عظیم بیگ ، تو بن مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں ۔"

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے ۔ آئے

تھے صرف ملاقات کرنے ، لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاھد ، جو ھماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رھے تھے ، بھوک سے تنگ آ چکے تھے ۔ ملاد پہنچتے پہنچتے ایک بج جانے کا لہٰذا کھانا کھا ھی لیا جائے ۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ھوٹل سے روٹی لینے چلا گیا ۔

" ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجیے ۔" منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا ۔ وھی میز ، جو دم بھر پہلے ادبی کار گزاریوں کا میدان بنی ھوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی ضروریات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے " پہلے آپ " کہے ھم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ھوں ۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رھا ۔ گھوم پھر کر منٹو " لحاف " کے بخیے ادھیڑنے لگتا اور " لحاف " میری دکھتی رگ بنا ھوا تھا ۔ میں نے بہت ٹالنا چاھا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رھا ۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے " لحاف " لکھنے پر افسوس ھے ۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا ۔ میں " لحاف " کو اپنا شاھکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مصر تھا ۔ تھوڑی ھی دیر میں " لحاف " سے بھی بڑھ چڑھ کر ھم نے بحث کر ڈالی ، نہایت کھل کر ۔ اور مجھے تعجب ھوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بے ھودہ سے بے ھودہ بات دھڑ سے اس معقولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ھے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ھوتی ، یا وہ مہلت دیتا ھی نہیں ۔ اس کی باتوں پر ھنسی آ جاتی ھے ، گھن یا غصہ نہیں آتا ۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا ۔ اتنی دیر ھم بیٹھے رھے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا :

" صفیہ بہت اچھی لڑکی ھے ۔"

" صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ھے ۔"

" آپ اس سے مل کر بہت خوش ھوں گی ۔"

" بہت یاد آ رھی ھے تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے ۔" میں نے کہا ۔

" ارے... کیا سمجھتی اس کے بغیر سو نہیں سکتا ۔" وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا ۔

" نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ھے ۔" میں نے بات ٹالی اور وہ ھنس پڑا ۔ " آپ کو صفیہ سے بہت محبت ھے ؟ " میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا ۔

" محبت ! " وہ چیخ پڑا ، جیسے میں نے اسے گالی دی ھو ۔ " مجھے اس سے قطعی محبت نہیں ۔" اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں ، " میں محبت کا قائل نہیں ۔"

" ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ھی نہیں کی ! " میں نے مصنوعی حیرت سے کہا ۔

" نہیں ۔"

" اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نہیں نکلے ، خسرہ بھی نہیں ھوئی ، مگر کالی کھانسی تو ضرور ھوئی ھو گی ۔" وہ ھنس پڑا ۔

" محبت سے آپ کا مطلب کیا ھے ۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ھے ۔ محبت ماں سے بھی ھوتی ھے ، بہن اور بیٹی سے بھی ۔ بیوی سے بھی ھوتی ھے ۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے

بھی ہوتی ہے ۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے ۔ ہاں مجھے اپنے بیٹے سے محبت تھی ۔" وہ بیٹے کے خیال پر آچک کر کرسی پر اونچا ہوگیا ۔ "خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا ۔ بڑا شریر تھا ۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درزوں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا ۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا ۔" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب ہونے کا یقین دلانا شروع کیا :

" آپ یقین کیجیے چھ سات دن کا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سلانے لگا ۔ میں اسے خود تیل مل کر نہلاتا ۔ تین مہینے کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا ۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا ۔ دودھ پلانے کے سوا اس کا کوئی کام نہ کرتی ۔ رات کو تو بس پڑی سوئی رہتی ۔ میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا ، اسے خبر بھی نہ ہوتی ۔ بچے کو دودھ پلوانے سے پہلے بوڈی کاون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیے نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں ۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مردوا ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے ۔

" مگر وہ مر گیا ۔" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرے پر لا کر کہا ، " اچھا ہوا جی وہ مر گیا ۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا ۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا ، نکما ہو کر رہ جاتا ، مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا ۔ سچ مچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا ۔"

چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ " صفیہ آنے والی ہے ، بس

جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر ۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہوگیا ۔ منٹو میں ہماری اتنی گٹھ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں ، عورتیں ہی سنتی ہیں ؛ جو مردوں کے کانوں کے لیے نہیں ہوتیں ۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا اور طعنے دینے لگا ۔ اس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سن لی تھیں ۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا :

" توبہ توبہ ! میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی باتیں کرتی ہیں ۔"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے ۔

" اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی امید نہ تھی کہ یوں محلے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی : کب شادی ہوئی ؟ شادی کی رات کیسی گزری ؟ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا ؟ توبہ ہے ! " وہ چڑانے لگا ۔

میں نے فوراً لگام لگائی : " حد ہے منٹو صاحب ! میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی ۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں ! ان میں گندگی کیا ہے ۔ بچے کی پیدائش دنیا کا حسین ترین حادثہ ہے ، اور یہ کانا پھوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے ۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کہ کالج میں مجھے بچے دینا سکھایا گیا ہے ۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے ۔ محلے کی عورتوں ہی سے

تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں ۔"

" یہ صفیہ سخت جاہل ہے ۔ ادب ودب کچھ نہیں سمجھتی ۔ ہر بات پر تھو تھو کرتی ہے ۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے ۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے کہ قورمے میں کتنی ہلدی ، ارد کی دال کے دھی بڑے ...." " اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے ؟ "

اور منٹو لڑ پڑا ۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیے ، اور جو نہیں پڑتی تو سراسر ظلم اور نا انصافی ہے ۔ " میرا ایک راجپوت دوست تھا ۔ وہ گھی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا ۔ پورا پہلوان تھا ۔" اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی چھوڑ کیچڑ پیتا تھا ، ہم کسی شرط پر ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں اور منٹو کو قائل ہونا پڑا ۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادے سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا ۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے ، جالا صاف ہو رہا ہے ، دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے ۔ اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں الجھ گئی ہیں اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی ، مگر دونوں بحثے جاتے ، الجھے جاتے ، بدمزگی پیدا ہونے لگتی ۔ مجھے اپنی شکست چھپانے کا ملکہ تھا مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا ، آنکھیں مور پنکھوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں ، نتھنے پھڑکنے لگتے ، منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاھد کو

پکارتا اور جنگ ، ادب یا فلسفے سے پلٹ کر ، گھریلو صورت اختیار کر لیتی ۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا ۔ شاھد مجھ سے لڑتے کہ " تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو ؟ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اس کے ہاں جاؤں ۔ وہ بدتمیز آدمی ہے ، کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی ۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی ، ممکن ہے وہ روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی ۔ منٹو کی خود داری رعونت کی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی ۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا ۔ اور اگر ان دوستوں کے سامنے ، جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو ، کوئی اس کا مذاق بنا دے تو وہ بری طرح چڑ جایا کرتا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ ویسے وہ اور میں پلے کے ہیں ، ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر " عام لوگوں " کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہییں ۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا ۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں ۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے ، ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے ، مگر میرا جلد ہی تصنع سے دل اکتا جاتا اور اس کا بھی اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے

آتش‌بازی اور گولیوں کی سی تندی آ جاتی ۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا کر مزہ لینے لگتے اور ہم پھر جل کر ایک دوسرے سے مل جاتے ۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لیے، نہ کہ ان کے لیے بٹیریں بن کر لطف پیدا کرتے ۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیے، اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا ۔ مگر مجھے عموماً مورچے سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح پھنکارنے لگتا ۔

یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے ۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی ۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہؤا ۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشے میں نہیں اور جان کو آ جاتا تھا :

" میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشے میں نہیں اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں ۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگائیے ۔"

" میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے ۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے اور آپ نشے میں ہیں ۔"

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں ، وہ اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے ۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا ۔ میں جیت

گئی ۔ مگر کیا ؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی ۔ اس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھتی اور وہ شرط لگانے پر اُڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے گلو خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی ۔

منٹو کو خود ستائی کی عادت تھی ۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا میں کسی کو ادیب نہ مانتا ۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا ۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اُٹھتا ۔ میں کہتی : " آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے ۔" اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا ۔ ایک سرے سے ان کے وجود کو ہی سمِ قاتل سمجھتا ، خاص طور پر ادب کے لیے ۔

" بکواس کرتے ہیں یہ لوگ ۔" وہ جل کر کہتا ، " جو یہ کہتے جائیں بس اس کا اُلٹا کرتے جاؤ ۔ یہی لوگ ، جو اعتراض کرتے ہیں ، چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کی بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں ۔" وہ کبھی اتنا چڑ جاتا کہ میں اسے تسلی دینے کو کہتی : " جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں ؟ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجیے، مگر رائے عامہ کو تو مطعون نہ کیجیے ۔" مگر وہ بھناتا رہتا ۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے :

" مقدمہ دائر کریں گے ۔"

میں نے کہا : " کون ۔"

کہنے لگے : " ہم ، یعنی میں اور آپ ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعے میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے ، ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہیے ۔ اب اس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے ۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے ، دوسرے پیسے کمانے کا الگ انتظام کر رہا ہے ۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں ۔ اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے ۔" پھر نہ جانے بھول بھال گئے ۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا ۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجیب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی ۔ جب اس کا تذکرہ کیا یہی کہا : " بڑا بدمعاش ، لفنگا ہے ۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے ۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں جس کی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوا لی ہو ۔"

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں ۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا ۔ ایک دن مجھے اس سے ملانے کو کہا ۔ میں نے کہا : " کیا کروں گی مل کر ؟ آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ ۔"

کہنے لگے : " ارے جبھی تو ملا رہا ہوں ۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے ۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے ۔"

میں نے کہا : " منٹو صاحب لفنگا ، شریف ، بدمعاش ! یہ آخر کیسا آدمی ہے ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسا نہیں ۔"

" آپ بنتی ہیں ۔" منٹو نے برا مان کر کہا ، " جبھی تو میں آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں ۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے ۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی ۔"

" میں بھی تو عورت ہوں ۔" میں نے فکر مند بن کر کہا اور وہ کھسیانہ ہو گیا ۔

" میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں ۔"

" مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے ۔" منٹو نے قہقہہ لگایا ۔

" ہو سکتی ہے ! یہ خوب کہا ۔" مگر منٹو کو ضد ہو گئی ۔ " آپ کو اس سے ملنا پڑے گا ۔ دیکھیے تو سہی ۔"

" میں اسے اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں ۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پر عاشق نہ ہونا پڑے ۔"

اور رفیق سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے ۔ باوجود دنیا کے ساتوں عیب کرنے کے رفیق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہییں ۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے ، ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی ۔ یہ کیسے اور کیوں ؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی ۔ یہ منٹو کا میدان ہے ۔ وہ دنیا کی ٹھکرائی ، گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر

نکال لیتا ہے ۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے کیونکہ دنیا کے سنوارنے والوں کی عقل اور فیصلے پر اسے بھروسہ نہیں ۔ وہ ان کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اس کا موازنہ کرتا ہے ۔ عطر میں ڈوبی ہوئی عیش پسند دلہن سے میل اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے ۔ "بو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے ، غور سے دیکھیے تو جسم کے اندر روح بھی ہے ۔ عیش پرست طبقے کی پھٹے ہوئے دودھ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور کچلے ہوئے طبقے کی تصنع سے دور اصلیت ۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا اور وہ اس بت کو ، جس کی دنیا پوجا کرے ، زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا ۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخریہ سنایا کرتا ۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا : "یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں ۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبرو ریزی کی ۔" اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ وہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں ، اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔

"سب جھوٹ !" میں دھاندلی کرنے لگی ۔

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا ؟ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے ۔"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں ۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سن کر چلے آتے ہوں گے ۔"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر ۔"

"گانا سننے ۔" میں نے چڑایا ۔

"جی نہیں ، اپنے دام وصول کرنے ۔ اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے ۔" پھر بھی میں نے کہا :

"میں نہیں یقین کرتی ۔"

"وہ کیوں ؟" وہ اٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا ۔

"بس میری مرضی ۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں ۔"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں ۔"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں ، بے کار اسے نہ گھسیٹیے ۔"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ ..."

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں ؟"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں ۔ صفیہ کی گواہی دلوائی ۔ میں نے دو منٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں ، اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے ۔

صفیہ چپ سی ہوگئی : "اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا ..." وہ عجب گو مگو میں رہ گئی ۔

منٹو نے جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا کہ " یہ تو آج منوا کر چھوڑوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں ۔" اور میں نے کہہ دیا : " آج اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ، میں مان کے دوں گی نہیں ۔"

ایک تو نشہ ، دوسرے منٹو کے مزاج کی جبلی تلخی ، اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا ۔

صفیہ نے بسور کر کہا : " بہن مان جاؤ ۔" شاھد نے کہا : " بس اب گھر چلو ۔" مگر منٹو نے شاھد کی ٹانگ لینی شروع کی اور کہہ دیا کہ " بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا ۔" خاصا ہنگامہ ہو گیا ۔

بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاھد سے کہا : "چلو رنڈی کے یہاں ابھی ، اسی وقت ۔ آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں سؤر کا دودھ پیا ۔" مگر میں نے اور چڑایا :

" آپ جائیں وائیں گے نہیں ، یونہی بائسکلا برج پر گھوم کر آ جائیں گے اور ہم یقین نہیں کریں گے ، کیا فائدہ ؟ "

اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید ھی بجھی ہو ۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا :

" پھر کیسے یقین دلایا جائے ۔"

میں نے کہا : " ہمیں ، یعنی مجھے اور صفیہ کو بھی ، ساتھ لے چلیے ۔"

" میں نہیں جاؤں گی ۔" صفیہ بگڑی ، " تمہارا تو دماغ خراب ہؤا ہے ، تم ہی جاؤ ۔"

" جائے گی کیسے نہیں ۔" منٹو غرایا ۔

" چلو چلو ۔" صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے ۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے ، منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا ۔ دوسری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا : " مگر اب تو مان جاؤ ۔"

میں نے کہا : " قطعی نہیں ۔"

مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کے اپنے اصول یا یقین کی بنا پر ہے ، کیونکہ اگر وہ رنڈی کے کوٹھے پر گیا بھی ہو گا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہو گا جو باوجودیکہ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے ۔ اچھے اور بڑے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انہیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا اندازہ لگاتا تھا ۔ " خوشیا " جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگِ حمیت بھی پھڑک سکتی ہے ۔" گوپی ناتھ" جیسا رقیق انسان بھی دیوتاؤں پر بازی لے جا سکتا ہے ۔ بلند و مہان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں ۔ قومی رضاکار بدکار بھی ہو سکتے ہیں ، اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے ۔

کبھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ ڈور ٹوٹتی معلوم ہوتی ۔ ایک دن کسی بات پر ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا ، دانت پیس کر بولا :

" آپ عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے ۔"

" دل کا ارمان نکال لیجیے، مروت کی ضرورت نہیں ۔" میں نے چڑایا ۔

" اب جانے بھی دیجیے، کوئی مرد ہوتا تو بتاتے ۔"

" بتا تو دیجیے ، ایسے کون کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں ، نکال بھی دیجیے۔"

" آپ جھینپ جائیں گی ۔"

" قسم خدا کی نہیں جھینپوں گی ۔"

" تو آپ عورت نہیں ؟ "

" کیوں ؟ کیا عورت کے لیے جھینپنا اشد ضروری ہے چاہے جھینپ آئے یا نہ آئے ؟ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب ، آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ اصول بناتے ہیں ۔ میں سمجھی تھی آپ " عام لوگوں " کی سطح سے بلند ہیں ۔" میں نے مسکہ لگایا ۔

" قطعی نہیں...میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا ۔"

" تو پھر کہیے نہ وہ جھینپا دینے والی بات ۔"

" نہیں ، اب غصہ اتر گیا ۔" وہ ہنس کر بولا ۔

" اچھا دوستی ہی میں سہی ، بتائیے وہ کون سی خطرناک بات تھی ۔"

" کچھ نہیں ۔ اب کچھ یاد نہیں رہا ۔ کوئی خاص بات نہیں تھی ۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا ۔"

" بس ؟ " میں نے نا امید ہو کر کہا ۔

" یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا ۔" نادم ہو کر بولا ۔

" مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا ۔ میں نے ایسی لحیم شحیم

گالیاں سنی ہیں کہ حد نہیں ۔ اور میرے تھپڑ بھی خاصے زور کے پڑ چکے ہیں ۔ مگر پہلی دفعہ آپ نے عورت سمجھ کر رعایت کی ، میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار ۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا ۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاد جاؤں ۔ دروازہ حسبِ معمول کھلا ہؤا تھا ، جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے لیٹی ہے ، منٹو ہاتھ میں جھاڑو لیے سٹاسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے اور ناک پر کرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے ۔

" یہ کیا ہو رہا ہے ؟ " میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا ۔

" کرکٹ کھیل رہا ہوں ۔" منٹو نے بڑی بڑی مور پنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا ۔

" یہ لیجیے ! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں ۔" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی ۔

" ارے ! " صفیہ اٹھ بیٹھی ، " آؤ آؤ ۔"

" کاہے کا جھگڑا تھا ۔" میں نے پوچھا ۔

" کچھ نہیں ، میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں ۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام ، میں ابھی جھاڑو دے

سکتا ہوں ۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑے ، کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق لے لے ۔" صفیہ نے بسور کر کہا ۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لیے میں نے بن کر کھانسنا شروع کیا : " صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونکی ، اب آپ ارمان نکال لیجیے ۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے ۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا ۔ صفیہ ہنڈیا بگھارنے چلی گئی ۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پر مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا ۔

" اور سنائیے؟ " اس نے حسبِ عادت کہا ۔ ہانڈی کے بگھارنے سے مجھے زور سے ابکائی آئی ۔

" افوہ ! یہ صفیہ کیا مردہ جلا رہی ہے ۔" میں نے ناک بند کر کے کہا ۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا ، سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور چھلانگ مار کر جھپٹا ۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا ۔

واپس آ کر وہ سہما سہما رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا ۔

میں بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی ۔

صفیہ ہڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا اور پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا :

" آپ کے پیٹ میں بچہ ہے ۔" جیسے بچہ میرے نہیں

خود اس کے پیٹ میں ہو ۔" میں نے فوراً تاڑ لیا ۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی بگھار سے ابکائی آتی تھی ۔"

" منٹو صاحب خدا کے لیے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو ۔" میں نے چڑ کر کہا ۔ وہ زور سے ہنسا :

" ارے واہ ، اس میں کیا برائی ہے ۔ ارے آپ کو کھٹی چیزیں بھاتی ہوں گی ۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں ۔" وہ لپک کر نیچے گیا اور کرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا ۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا ۔

" صفیہ ، ارے صفیہ ۔" وہ چلایا ۔ صفیہ دھوئیں سے اٹی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی ۔ " کیا ہے منٹو صاب ، کتنا چلاتے ہو ۔"

" ارے بے وقوف ، ان کا پیر بھاری ہے ۔" اس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ۔

" آف ! گندگی کی انتہا ہے ۔ جبھی تو آپ کو لوگ خوش نگار کہتے ہیں ۔" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب خوب چہکا اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا :

" پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے کھرونچے نہیں پڑیں گے ۔"

" نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے ابکائیاں نہیں آتیں ۔"

" کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا ۔"

" جاپے میں برف نہ چبائیے گا ، نلے سوج جاتے ہیں ۔ کیوں صفیہ ؟ "

” ہٹو منٹو صاب ، کیسی باتیں کرتے ہو ۔“ صفیہ کھسیا کر رہ گئی ۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا ۔ وہ دیر تک مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا ۔ صفیہ کا دل پگھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی نکہت پیدا ہو گئی ۔ پونے سے آنے کے بعد مجھے معلوم ہؤا ، میں فوراً گئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا ۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں ۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا ۔ منٹو نے اس لیے بدل لیا کہ پہلے کا فرش گندہ تھا ۔ بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی ۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی — حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی ۔

” مجھے بچے سخت ناپسند ہیں ۔“ منٹو سنجیدگی سے کہتا ، ” جان کو چمٹ جاتے ہیں ۔ مجھے ان سے اسی لیے ڈر لگتا ہے ۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے ، کسی کام میں دل نہیں لگتا ۔“ وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا ۔ میری بھتیجی ، مینو ، اسے بڑی پیاری تھی ۔ گھنٹوں اس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا ۔ فرمائش پر کھڑکی سے بانس ڈال کر اس کے لیے املیاں توڑ کر نیچے سے کرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا ۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر ”شی شی“ کرتا ۔ اور بچوں کا بہت شاکی تھا کیوں کہ وہ ان کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا ۔

ایک دن ، جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے ، رات کے کوئی ساڑھے

بارہ ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔ معلوم ہؤا صفیہ سانس پھولی ہوئی سی کھڑی ہیں ۔ میں نے پوچھا : ” کیا ہؤا ۔“ بولی : ” میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ کہاں سنتے ہیں ۔“ منٹو مع نندا جی اور خورشید انور کے آ گئے ۔

” یہ صفیہ کون ہوتی ہے منع کرنے والی ۔“ ہاتھ میں بوتل اور گلاس لیے تینوں در آئے ۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا ۔ طے ہؤا بہت بھوکے ہیں ، ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں ، ریل کا وقت گزر گیا ، کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھا لیں ؛ بس آٹا دال دے دو ، خود باورچی خانے میں جا کر پکا لیں گے ۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا مگر وہ کہاں مانتے تھے ، باورچی خانے پر چڑھائی کر دی ۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے ، نندا جی انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیے گئے ، جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے ۔ اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی ۔ یہ لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے ، کھاتے گئے ۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکا لی اور پھر جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی ۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا ۔

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی : معقول آمدنی ہو ، پینا پلانا ہو ، قہقہے ہوں اور بے فکریاں ۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی ۔ اسی زمانے میں

لاهور گورنمنٹ نے میرے پر مقدمہ چلا دیا ۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی ۔ لاهور میں بھی لطف آ گیا ۔ خوب دعوتیں اڑائیں ۔ اسی بہانے لاهور کی زیارت ہو گئی ۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے ۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے، جیسے کنول کے پھول ۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے ۔

" میرے پیر بڑے بھدے ہیں ، میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے ۔" میں نے کہا ۔

" اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے ۔" مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے ۔

" آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں ۔" میں نے کہا ۔

" بکواس ہیں میرے پیر ، لائیے بدل لیں ۔"

" بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں ۔" میں نے رائے دی ۔

" بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔" منٹو نے چہک کر کہا ۔

محبت کے مسئلے پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے ۔ وہ یہی کہتا :

" محبت کیا ہوتی ہے ؟ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے ، رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے ۔"

" میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے ۔"

" ہاں ، میں سمجھ گیا ۔" منٹو نے دور ، ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا ، " کشمیر میں ایک چرواہی تھی ۔"

" پھر ؟ " میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارہ دیا ۔

" پھر کچھ نہیں ۔" وہ ایک دم بجھاؤ کے لیے تن گیا ۔

" آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرما رہے ہیں ۔"

" کون گدھا شرما رہا ہے ۔" منٹو نے واقعی شرما کر کہا ۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا :

" بس جب وہ مویشی ہانکنے کے لیے اپنی لکڑی اوپر اٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی ۔ میں کچھ بیمار تھا ۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو اس کی آستین سرک جائے اور مجھے اس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے ۔"

" کہنی ! " میں نے حیرت سے پوچھا ۔

" ہاں ۔ میں نے سوائے کہنی کے اس کے جسم کا اور کوئی حصہ نہیں دیکھا ۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی ، اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا ، مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لیے لپکتی تھیں ۔"

" پھر کیا ہوا ؟ "

" پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی ۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی ۔ میں نے کہا : ' مجھے دکھاؤ ' تو شرم سے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا اور بولی کچھ بھی نہیں ۔ بس مجھے ضد ہو گئی ۔ میں نے کہا :

' جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا ۔' وہ روہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پر اڑ گیا اور آخر بڑی رد و کد کے بعد اس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور خود شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا ۔

" کیا تھا اس کی ہتھیلی پر ۔" میں نے بے صبری سے پوچھا ۔

" مصری کی ڈلی ! اس کی گلابی ہتھیلی پر برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی ۔"

" پھر آپ نے کیا کیا ؟ "

" میں دیکھتا رہ گیا ۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا ۔

" پھر ؟ "

" پھر وہ اٹھ کر بھاگ گئی ۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہوگئی ۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیض کی جیب میں پڑی رہی ۔ پھر میں نے اسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں ۔"

" اور لڑکی ۔"

" کون سی لڑکی ؟ " وہ چونکا ۔

" وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی ۔"

" اسے میں نے پھر نہیں دیکھا ۔"

" کس قدر پھس پھسا ہے آپ کا عشق ! " میں نے ناامیدی سے چڑ کر کہا ، " مجھے تو کسی بڑے شعلہ ہداماں قسم کے عشق کی امید تھی ۔"

" قطعی پھس پھسا نہیں ۔" منٹو لڑ پڑا ۔

" بالکل ردی ، تھرڈ ریٹ ، مرگھلا عشق ۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے ، بڑا تیر مارا ۔"

" تو اور کیا کرتا ؟ اس کے ساتھ سو جاتا ! ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا ! " وہ بگڑا ۔

" ٹھیک کہتے ہیں آپ ، مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے ۔"

یہ وہی منٹو تھا : خش نگار ، گندہ دھن ۔

" جس نے ' ہو ' لکھی تھی ۔

جس نے ' ٹھنڈا گوشت ' لکھا تھا ۔

لیکن مرزا غالب میں چودھویں بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ؛ مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا ، جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے ۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا ۔ ایک طرف وہ " نیا قانون " لکھتا تھا اور دوسری طرف " ہو" ۔ دونوں میں وہ خود کو غرق کرکے لکھتا ہے ۔ لوگوں کو ایک خش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقع نگار کو وہ بھول جاتے ہیں — قصداً یا سہواً — ایک ہی بات ہے ۔

ملک میں فساد شروع ہو گئے ۔ بٹوارے کے بعد اس طرف کے لوگ اس طرف جانے لگے ۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا ۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا ۔ مدح

سرائی ، جو اس کی زندگی کا سہارا تھی ، اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم " آٹھ دن " کامیاب نہ ہوئی ۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا ۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا ۔ مکرجی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اس کے خلاف ہو گیا ۔

" بکواس ہے مکرجی ، فراڈ ہے پکا ۔" وہ تلخی سے کہتا ۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کہنی میں ایک سال کے لیے سینیریو ڈیپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہؤا : " اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے ، تہلکہ مچ جائے گا ۔ میری اور آپ کی کہانی ، اشوک کمار ہیرو ۔ بس پھر دیکھیے گا ۔"

ایک کہانی منٹو کی زیرِ غور تھی ۔ اشوک کو وہ پسند تھی ۔ اس سے پہلے اسے مجبور کی کہانی پسند تھی ، پھر دل سے اتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی ۔ میرے آنے کے بعد اسے میری کہانی "ضدی" پسند آ گئی ۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گزرا ۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر ۔ نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے ۔ ادھر کمال امروہی " محل " کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی ۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی ۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار و قطار ہی میں نہیں ۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو ، تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے ،

لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی ۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی " ضدی " کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجے کی تصویروں کی قطار میں " ضدی " بنائی جانے لگی ۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی ۔ منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی ادھیڑ بن کیا کرتا : کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا ، کبھی آغاز کو انجام بنا کر ، کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا ۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی ۔ مگر منٹو یہی کہتا :

" آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں ، میں سمجھتا ہوں ، وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا ۔"

" آپ کی کہانی میں اس کا رول رومنٹک نہیں باپ کا ہے ، وہ کبھی نہیں کرے گا ۔" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی ، مگر دبی زبان سے ۔ یہاں اپنی فکر پڑی تھی ۔ اور وہی ہؤا کہ " ضدی " اور " محل " بن گئیں ، منٹو کی کہانی رہ گئی ۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی ۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا ، بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا ۔ ادھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے ۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے ۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا : پاکستان میں حسین مستقبل ہے ۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی ۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے ، بہت جلد ترقی کر جائیں گے ۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا ۔

اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی ۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہؤا منٹو کتنا بزدل ہے ، کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے ، اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے ۔۔ اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی ۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا ، مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی ۔

پھر اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے ؛ بہت عمدہ مکان ملا ہے ، کشادہ اور خوبصورت ، قیمتی سامان سے آراستہ ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا ۔ " ضدی " ختم ہو گئی تھی اور ہم نے " آرزو " شروع کر دی تھی ۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے ۔ اس کے پھر دو خط آئے ۔ اس نے بلایا تھا ، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی ۔ مجھے بڑا دکھ ہؤا ۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا ۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیے ، اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا ۔ میں نے تو جانے سے نہیں روکا ، پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے ؟

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے ۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے ۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی ۔

اور سال گزرتے گئے ۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی ۔ منٹو کا ایک خط آیا : " کوشش

کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو ۔"

پھر معلوم ہؤا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی ۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے ، کسی نے احتجاج بھی نہ کیا ، بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہؤا جیل ہو گئی ، اب دماغ درست ہو جائے گا ۔ نہ کہیں جلسے ہوئے ، نہ میٹنگیں ہوئیں ، نہ ریزولیوشن پاس ہوئے ۔

پھر معلوم ہؤا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں ۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا ۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں ، اگر مکرجی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو ۔ اس کے بعد عرصے تک کوئی خیر خبر نہیں ملی ، نہ ہی میرے خط کا جواب آیا ۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے ۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا ، پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو ۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا ۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اوب گیا : بے طرح پینے لگے ہیں ۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں ۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں ، پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں ۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی ۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں ۔ منٹو

ھی نہیں عرصہ ھؤا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا ۔ آج صرف ایک کسک زندہ ھے ۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ھے ؟ کیا اس بات کی ندامت ھے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ھوں ؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ھے ؟ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں ۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا ! یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا ! مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ھیں اور کچھ نہیں کر پاتیں ۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ھیں جو نہ دکھتا ھے نہ رستا ھے ، خاموش سلگتا رھتا ھے ۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رھی ھے ۔ جی چاھتا ھے ایک بار سر جوڑ کر ھم ویسے ھی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ھوئے اڈلفی چیمبر میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پھلوٹھی کے بچے کی باتیں ، یہ ھیں موت کی باتیں ۔ اسی لیے ڈرتی ھوں اور میرا قلم خشک ھو جاتا ھے ۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس کے دل پر کیا گزری ھے ۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ھستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رھی یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ھو چکا تھا ! کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی منٹو کی صفیہ رھیں ! پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتے دار جب اس کی بدروی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں ؟ ان خاموش گیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں ؟ دم تو نہ گھٹ

جاتا تھا ؟ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ھی سدھارا ؟ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل ، مفلس ، شرابی سمجھتی تھیں ؟ اس نے تمہیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا ؟ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم ۔ نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ھے ۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رھا ۔ اس نے انھیں عیب کی طرح چھپایا ۔ اسے غرہ تھا کہ چاھے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے ۔ جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ھے ، اور اس کا قلم بے کسی سے گھسٹتا رھتا ھے ۔

تم عاجز تو نہیں آ گئیں ادیبوں سے ؟ یونہی خود گھسٹتے ھیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ھیں...اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ھیں ۔ تو بہن یہ ادیبوں ھی کی عادت نہیں ، ھمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ھوتے ھیں ، چاھے وہ ادیب ھوں یا کلرک ۔ ان کی یہی زندگی ھے اور کم و بیش یہی انجام ۔ جو زیادہ حساس ھوتے ھیں وہ پاگل ھو جاتے ھیں اور ڈھیٹ سسکتے رھتے ھیں ۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ھے کہ منٹو کی اس جواں مرگی میں میرا بھی ھاتھ ھے ، میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ھیں جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ھے ۔ وہ دنیا ، جس نے اسے مرنے دیا ، میری ھی تو دنیا ھے ! آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ھو گی اور پھر

لوگ ماتم کریں گے ۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا ۔ جلسے کریں گے ، چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا ۔ وقت گزر جائے گا ، سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے ۔

'Iṣmat Chughtā'ī

Dozakh : ḍrāme, afsāne, mazāmīn

Lahore
Nayā Idārah
1967

زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	۲/-
تین غنڈے	کرشن چندر	۲/-
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	۲/-
پانی کا درخت	کرشن چندر	۳/-
نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو	۲/-
لذتِ سنگ	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۲/۵۰
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	۳/-
لمبی لڑکی	راجندر سنگھ بیدی	۲/-
لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی	۲/-
اپنے دکھ مجھے دے دو	راجندر سنگھ بیدی	۳/-
رفیقِ تنہائی	علی عباس حسینی	۲/۷۵
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۲/-
سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۳/-
جدید ہندی افسانے (ترجمہ و انتخاب)	اشفاق انور	۳/-
منزل منزل	اے حمید	۳/-
خلا نوردوں کے افسانے	محمد سلیم الرحمان	۲/۵۰
آداس نسلیں	عبداللہ حسین	۱۲/-
سودائی	عصمت چغتائی	۲/۲۵
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۲/۵۰
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۷۵
دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۳/-
غدار	کرشن چندر	۱/۵۰
معیار	ممتاز شیریں	۳/۵۰
آؤ	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
شکنتلا	کالی داس	۲/-
و مزاح سرِ راہے	مسعود مفتی	۲/۵۰
مکتوباتِ اکبر	اکبر الہ آبادی	۱/۵۰
زیرِ لب	صفیہ اختر	۴/-